شیخ نذیر حسین

مولانا عبدالعزیز میمن

چند یادیں

عربی زبان کے مشہور محقق، ادیب اور انشا پرداز مولانا عبدالعزیز میمن نے ۹۰ برس کی عمر میں ۲۷ اور ۲۸ اکتوبر ۱۹۷۸ء کی درمیانی شب کو کراچی میں انتقال کیا۔ بلاریب کہا جا سکتا ہے کہ علامہ سید مرتضیٰ بلگرامی کے بعد اسلامی ہند نے اتنا بڑا عالمِ لغت اور ادب پیدا نہیں کیا۔ ان کی عظمت کا اعتراف عرب ممالک کے ادبا کو بھی تھا۔

مولانا میمن کا وطنِ مالوف راج کوٹ (کاٹھیاوار) تھا، جہاں وہ ۱۸۸۸ء میں ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آبائی پیشہ زمینداری تھا۔ نو، دس برس کی عمر میں وہ تحصیلِ علم کی غرض سے دہلی چلے آئے۔ ان دنوں دہلی علومِ اسلامیہ کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ شہر میں باکمال علما کے درس و تدریس کے حلقے بکثرت قائم تھے۔ میمن صاحب نے ابتدائی تعلیم مولانا عبدالرحمن پنجابی سے پائی جو مدرسۂ طبیہ (اب طبیہ کالج) میں استاد تھے، اور درسیات کی تکمیل مولانا محمد بشیر سہسوانی سے کی، جو نواب صدیق حسن خاں مرحوم کے زمانۂ عروج میں بھوپال میں قاضی رہ چکے تھے۔ ادب کی تعلیم کے لیے ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوئے جو عربی علم و ادب کے مسلم الثبوت استاد تھے۔ انھوں نے حماسہ، متنبی، مقامات اور سقط الزند ڈپٹی صاحب سے پڑھیں۔ میمن صاحب بیان کرتے تھے کہ ڈپٹی نذیر احمد مرحوم ترجمہ اس قدر خوب صورت کرتے تھے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ امیر حبیب اللہ خان والیِ افغانستان ایک دفعہ دہلی تشریف لائے تو ڈپٹی صاحب امیر حبیب اللہ خان سے ملنے گئے۔ اتفاق سے عید کا دن تھا۔ ڈپٹی صاحب نے متنبی کا عید اور وجہ حبیب والا شعر پڑھا۔ عید کے دن اور امیر صاحب کے نام کی مناسبت نے عجیب سماں پیدا کر دیا اور امیر صاحب بہت محظوظ ہوئے۔ اس زمانے میں معقولات کا بڑا شہرہ تھا۔ قدیم فلسفہ اور منطق کی کتابیں پڑھے بغیر کوئی شخص صحیح معنیٰ میں عالم کہلانے کا مستحق نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ان علوم کا سب سے بڑا مرکز مدرسہ عالیہ رام پور تھا۔ علامہ محمد طیب مکی صدر مدرس تھے، جو بلند پایہ ادیب تھے۔ ان کی علمی شہرت کی وجہ سے نہ صرف ہندوستان

بلکہ افغانستان اور ترکستان تک کے طلبا رام پور کھنچے چلے آتے تھے۔ میمن صاحب نے رام پور جا کر علامہ طیب صاحب سے استفادہ کیا اور فراغت کے بعد دہلی چلے آئے، جہاں رہ کر پنجاب یونیورسٹی کے مشرقی امتحانات منشی فاضل اور مولوی فاضل ۱۹۰۸ء اور ۱۹۰۹ء میں پرائیویٹ طور پر پاس کیے اور یونیورسٹی میں اوّل آئے۔

اس وقت شہر دہلی مجمع الکمال بنا ہوا تھا۔ بڑے بڑے علما، ادبا اور صلحا وہاں موجود تھے، لیکن مولانا میمن افسوس سے ذکر کیا کرتے تھے کہ دہلی احناف اور اہل حدیث علما کے فقہی اختلافات کا اکھاڑہ بنی ہوئی تھی۔ فریقین میں مناظرے ہوا کرتے تھے اور یہ مناظرے بسا اوقات مجادلے اور مقاتلے بن جایا کرتے تھے۔ وہ بیان کرتے تھے کہ مغلیہ سلطنت کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کو انتقال کیے ہوئے تقریباً نصف صدی کا زمانہ گزر چکا تھا، لیکن لوگوں کے دلوں میں بہادر شاہ کی یاد تازہ تھی۔ اس کی یہ غزل:

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے

بچے بچے کی زبان پر تھی۔ دہلی کا خونی دروازہ، جہاں مغل شہزادوں کو سولی دی گئی تھی، زیارت گاہ عوام و خاص تھا۔ ارزانی کا یہ عالم تھا کہ مصر کی چھپی ہوئی صحیح بخاری اڈھائی مین روپے میں مل جاتی تھی۔

اسی اثنا میں ان کو ایڈورڈ مشن کالج پشاور میں عربی و فارسی کے لیکچرار کی جگہ مل گئی اور وہ پشاور چلے آئے۔ اس زمانے میں انھوں نے لاہور کے مشہور ادبی رسالہ مخزن میں عربی کے نصابِ تعلیم کی اصلاح پر مضامین لکھے، جن میں کافیہ اور شرح ملا جامی کے بجائے ابن ہشام کی کتابوں (شرح قطر الندی اور شرح شذور الذہب) اور الفیہ کی شروح کو اختیار کرنے اور منطق و فلسفہ کے بجائے علم حدیث کے اشتغال اور مزاولت پر زور دیا گیا تھا۔

اپریل ۱۹۲۱ء میں وہ مولوی محمد شفیع کی قدردانی سے اورینٹل کالج لاہور میں ایڈیشنل مولوی کی حیثیت سے تشریف لے آئے۔ یہ زمانہ اورینٹل کالج کے شباب کا زمانہ تھا۔ شعبہ عربی میں مولوی محمد شفیع کے علاوہ مولوی نجم الدین اور مولانا سید محمد طلحہ (سید ابوالحسن علی ندوی کے پھوپھا) بھی تھے، جب کہ شعبہ فارسی میں ڈاکٹر شیخ محمد اقبال (مترجم ایران بعہد ساسانیان) اور سید وجاہت حسین بلگرامی (رام پوری) تدریسی خدمات انجام دیتے تھے۔ ان اساتذہ کے علم و فضل اور تدریسی مہارت کی شہرت سن کر یوپی، بہار، ریاست ہائے راجپوتانہ بلکہ حیدرآباد (دکن) تک سے بھی طلبا لاہور کا رخ کرتے تھے۔ مولانا میمن کالج میں عربی تدریس کے علاوہ اورینٹل کالج کے ہوسٹل کے بھی نگران تھے، جو حضوری باغ میں تھا۔ اس دور کے شاگردوں میں مولوی امتیاز علی عرشی

رام پوری، ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ مرحوم اور ڈاکٹر سید عبداللہ قابلِ ذکر ہیں۔ سید عبداللہ صاحب بیان کرتے ہیں کہ مولانا میمن سبعہ معلقہ اس مہارت اور عمدگی سے پڑھاتے تھے کہ تعریف نہیں ہوسکتی۔ لاہور کے زمانۂ قیام میں انھوں نے مولوی محمد شفیع مرحوم کی تبلیغ اور شوق سے خزانۃ الادب (عبدالقادر بغدادی) کا انڈکس الکلید الخزانہ کے نام سے شائع کیا۔ مشہور عرب شاعر ابوالعلاء المعری کے حالات اور فلسفہ شاعری میں ابوالعلاء المعری وما الیہ کے نام سے ایک کتاب لکھی جو دار المصنفین کی طرف سے قاہرہ سے چھپ کر شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ انھوں نے ابن رشیق کے حالات لکھے اور اس کے اشعار کا مجموعہ مختلف ادبی کتابوں کو کنگھال کر شائع کرایا۔ اورینٹل کالج میگزین کا اجرا ہوا تو مولوی محمد شفیع صاحب نے میمن صاحب کو بھی اردو میں لکھنے کی ترغیب دی اور ان کی ہر طرح سے علمی رہنمائی کی۔ بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ میمن صاحب میں علمی لگن اور ذوقِ تحقیق و جستجو مولوی محمد شفیع مرحوم ہی نے پیدا کیا۔ حیرت ہے کہ میمن صاحب نے شفیع صاحب کے احسانات کا کبھی بھی اعتراف نہیں کیا۔

اکتوبر ۱۹۲۵ء میں مسلم یونیورسٹی میں عربی کے ریڈر کی آسامی خالی ہوئی تو میمن صاحب غالباً علامہ اقبال مرحوم کی سعی و سفارش سے علی گڑھ چلے گئے اور ۱۹۵۰ء میں صدر شعبہ عربی کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے۔ ان کی آمد سے قبل عربی شعبے کا صدر جرمن یا برطانوی مستشرق ہوا کرتا تھا، جس کی وجہ سے یہ شعبہ خاطر خواہ ترقی نہیں کرسکا تھا۔ معیارِ تعلیم کی پستی کا یہ عالم تھا کہ ایم، اے (عربی) کے کورس میں بائبل کا عربی ترجمہ شامل تھا۔ میمن صاحب نے نصابِ تعلیم کی اصلاح کی، عربی ادب کی امہات کتب، مثلاً الکامل (المبرد) اور کتاب العمدہ (ابن رشیق) نصاب میں داخل کیں، شعبہ عربی کا وقار ہندوستان اور بیرونِ ہندوستان میں قائم کیا اور طلبا میں صحیح علمی ذوق اور ملکۂ تحقیق پیدا کیا۔ ان کے درس و تدریس سے بہت سے مستعد طلبا نے فائدہ اٹھایا جن میں ڈاکٹر نبی بخش بلوچ (حیدر آباد سندھ، اب اسلام آباد)، ڈاکٹر سید محمد یوسف مرحوم (کراچی یونیورسٹی)، ڈاکٹر مختار الدین آرزو (مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ) اور ڈاکٹر خورشید احمد فارق (دہلی یونیورسٹی) قابلِ ذکر ہیں۔ افسوس ہے کہ ڈاکٹر محمد یوسف نے جن کو میمن صاحب بھی بہت مانتے تھے، ٹریفک کے حادثے میں گزشتہ ستمبر میں لندن میں انتقال کیا۔

علی گڑھ کے قیام کے دوران میں ان کا قابلِ ذکر کارنامہ امالی القالی کی شرح کی اشاعت ہے۔ اس کی شرح ایک اندلسی عالم ابوعبید البکری نے اللآلی کے نام سے پانچویں صدی ہجری میں لکھی تھی جو نایاب تھی۔ میمن صاحب نے

اس کے متعدد نسخے بہم پہنچائے، ان کے مقابلے اور تصحیح سے ایک صحیح نسخہ مرتب کیا، اس پر حواشی لکھے، شارح کی غلطیوں اور فروگزاشتوں کی نشاندہی کی اور ۱۹۳۵ء میں خود قاہرہ جاکر اس کو سمط اللآلی کے نام سے شائع کرایا۔ علمی حلقوں میں اس کتاب کی خوب پذیرائی ہوئی جو آئندہ چل کر عالم عرب میں ان کی شہرت اور تعارف کا ذریعہ بنی۔ امام عبدالقاہر الجرجانی نے ابوتمام، بحتری اور متنبی کے دواوین کا انتخاب الطرائف الادبیہ کے نام سے کیا تھا۔ یہ بھی اسی زمانے میں میمن صاحب کے حواشی اور ضروری تشریحات کے ساتھ شائع ہوا۔ الفتح کے فاضل مدیر محب الدین الخطیب کی فرمائش پر خزانۃ الادب (عبدالقادر بغدادی) کی جدید اشاعت میں حصہ لیا۔ اس کی صرف چار جلدیں شائع ہوسکیں۔ یہ کتاب دیکھنے کو تو شیخ رضی استرآبادی کی شرح کافیہ کے شواہد کی شرح ہے، لیکن حقیقت میں عربی ادب کا خزانہ ہے، جس سے کوئی ادیب مستغنی نہیں ہوسکتا۔ اب اس کو مصر کے مشہور محقق عالم استاذ عبدالسلام محمد ہارون جدید تحقیق، تصحیح اور تحشیہ کے جملہ لوازم کے ساتھ شائع کر رہے ہیں اور اس کی چھ سات جلدیں شائع ہو چکی ہیں اور بقیہ زیر طباعت ہیں۔ میمن صاحب نے مصری حکومت کے اصرار پر لسان العرب کی بھی تصحیح کی، لیکن اس کی صرف ایک جلد شائع ہوسکی۔ اس کاوش میں مسٹر کرینکو بھی ان کے شریک کار تھے۔

۱۹۵۵ء میں وہ کراچی یونیورسٹی کے شعبہ عربی کے صدر بن کر پاکستان چلے آئے۔ اس دور کا علمی کارنامہ دیوان حمید بن ثور الہلالی اور الفاضل (المبرد) کی اشاعت ہے۔

دسمبر ۱۹۵۷ء میں راقم السطور کو ان کی زیارت اور ملاقات کا پہلی دفعہ شرف حاصل ہوا۔ اسلامی کلچر کیمپ (مذاکرہ) لاہور میں بہت سے مستشرقین اور عرب کے متعدد فضلا مدعو تھے، جن میں نمایاں شخصیت شام کے مشہور سلفی عالم شیخ محمد بہجت بیطار کی تھی[1] اس سے قبل میں ان کے علمی مقالات اور نئی کتابوں پر متوازن تبصرے

---

[1] افسوس ہے کہ بیطار صاحب نے گزشتہ برس دمشق میں انتقال کیا۔ وہ عالم متبحر، زندہ دل اور باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ عمر بھر شام کی علمی مجلس مجمع العلمی العربی کے نائب صدر رہے۔ وہ پاکستان کے سچے بہی خواہ اور ہمدرد تھے۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں انھوں نے دمشق میں پاکستان کی حمایت میں ایک جلوس کی قیادت بھی کی تھی۔ اللہ تعالیٰ انھیں اپنی رحمت و مغفرت سے نوازے۔

مجمع العلمی العربی (دمشق) کے سہ ماہی مجلہ میں پڑھ چکا تھا اور ان سے غائبانہ عقیدت رکھتا تھا، چنانچہ میں استادِ محترم شیخ محمد العربی المراکشی کی معیت میں فلیٹی ہوٹل پہنچا جہاں عرب مندوبین موجود تھے۔ معلوم ہوا کہ شیخ محمد بہجت بیطار مولانا محمد ادریس کاندھلوی (شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ) کے ہاں چلے گئے ہیں۔ ان کی تلاش میں ایک اور صاحب بھی سرگرداں تھے، لمبا قد، چھریرا بدن، خشخشی داڑھی، اور ترکی ٹوپی، اچکن اور پاجامے میں ملبوس۔ مراکشی صاحب نے بتایا کہ یہی مولانا عبدالعزیز میمن ہیں۔ ہم سب مل کر مولانا محمد ادریس کاندھلوی کے فضیلت کدے پر پہنچے، جہاں بیطار صاحب بلبل ہزار داستان بنے شیعوں کے متعلق لطائف وظرائف بیان کر رہے تھے اور ساری محفل کو کشتِ زعفران بنا رکھا تھا۔ ان کے ساتھ شام کے مشہور عالم استاد محمد المبارک بھی تھے۔ میمن صاحب کی آمد پر علمی مسائل چھڑ گئے جس میں میرے اندازے میں میمن صاحب کا پلہ بھاری رہا۔ دوسرے روز سب مندوبین مدرسۃ البنات میں مدعو تھے۔ مدرسہ والوں کی خیر مقدمی تقریر کے بعد شیخ بہجت بیطار جوابی تقریر کے لیے کھڑے ہوئے تو پاکستان کے حوالے سے کشمیر کا ذکر کر دیا۔ اس پر حیدر آباد دکن کے مندوب مسٹر امیر علی[۵۲] بھڑک اٹھے اور کہا کہ اس تقریب کا سیاسی مسائل سے کیا تعلق؟ اس وقت بیطار صاحب نے جس دینی غیرت وحمیت کا ثبوت دیا، اس کی یاد آج بھی مسرت انگیز ہے۔ وہ جوش میں آکر کہنے لگے کہ میں ایک دفعہ نہیں سو دفعہ کہوں گا بلکہ ہزار بار کہوں گا کہ کشمیر پاکستان کا ہے اور پاکستان کو ملنا چاہیے۔ ڈاکٹر عبدالوہاب عزام مرحوم نے بیطار صاحب کو ایک طرف لے جا کر بہ مشکل چپ کرایا۔ بیس اکیس برس گزرنے کے باوجود اس محفل کی یاد شرکا کے دلوں میں ابھی تک تازہ ہے۔

۱۹۶۰ء میں سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک ریسرچ (ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی) قائم ہوا، تو میمن صاحب اس سے متعلق ہو گئے۔ اس وقت سب سے مشکل کام کتب خانہ کی فراہمی تھا۔ اس کے لیے انھوں نے عراق، شام، مصر، ترکی اور تونس کا سفر کیا اور ضروری کتابیں خرید کر لائے۔ ۱۹۶۴ء میں وہ جناب ممتاز حسن کی تحریک اور پروفیسر حمید احمد خان مرحوم (سابق وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی) کی قدر دانی اور معارف پروری

---

۵۲ غالباً یہ امیر علی وہی ہیں، جنھوں نے قرآنِ مجید کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ ان کی عربی زبان سے ناواقفیت اور مشتعل مزاجی کی شکایت مصر کی مشہور ادیبہ عائشہ عبدالرحمان (بنت الشاطی) نے بھی کی ہے۔ اس کے لیے ان کی کتاب تراثنا (مطبوعہ دار المعارف، قاہرہ) ملاحظہ ہو۔

کی بہ دولت عربی زبان کے صدر شعبہ بن کر اورینٹل کالج میں تشریف لے آئے اور لاہور میں دو سال مقیم رہے۔ افسوس ہے کہ اس مرتبہ ان سے خاطر خواہ استفادہ نہ ہو سکا۔ اب وہ پیرانہ سالی کی وجہ سے درس و تدریس کے بجائے علمی و تحقیقی کاموں میں رہنمائی کے لیے زیادہ سود مند ہو سکتے تھے۔

مولانا میمن کا معمول تھا کہ وہ ہر اتوار کو مولانا عبید الحق خان ندوی کے مکتبۃ العلمیہ میں آتے تھے۔ عربی زبان و ادب سے شغف رکھنے والے اصحاب بھی ان سے ملنے وہیں چلے آتے تھے۔ راقم بھی بالالتزام ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہتا تھا۔ یہ پُر لطف نشست دو ڈھائی گھنٹے جاری رہتی جو علمائے سلف، ان کی نادر تصانیف، نواب صدیق حسن خان کی علمی خدمات اور ہندوستانی محدثین کے کارناموں کے ذکر سے معمور رہتی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ گزشتہ صدی کے آخر میں مولانا اسمٰعیل شہید اور مشائخ دیوبند کے خلاف الزام تراشی اور سب و شتم کی جو تحریک اٹھی تھی، اس کے پس پردہ انگریز کا ہاتھ تھا۔ وہ یہ بھی بتلاتے تھے کہ لارڈ مونٹ بیٹن کے جانے کے بعد جو خفیہ کاغذات ایوانِ حکومت (دہلی) سے برآمد ہوئے تھے، ان میں اس تحریک کے ہنماؤں کو حکومتِ برطانیہ کے بہت بڑے خیر خواہ اور ہمدرد بتلایا گیا ہے۔ ان کی گفتگو کا دلچسپ موضوع نادر علمی کتابیں تھیں جن کی تلاش اور جستجو میں انھوں نے دمشق، قاہرہ، قسطنطنیہ اور رباط کے کتب خانے چھان مارے تھے۔ قسطنطنیہ کے علمی خزائن، عجائب گھر اور سلاطین آلِ عثمان کے تاریخی آثار، وہ دلکش موضوع تھا جس پر وہ حاضرینِ مجلس کو گھنٹوں تک اپنی پُر لطف گفتگو سے لطف اندوز کرتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ انھوں نے سلطان ٹیپو کی سفارت کا حال سنایا جو سلطان نے خلیفۃ المسلمین کی خدمت میں مدد و اعانت کے لیے قسطنطنیہ بھیجی تھی۔ اس سفارت کو زیادہ پذیرائی حاصل نہ ہو سکی اور اس کے ارکان قسطنطنیہ ہی میں مرکھپ گئے۔ میمن صاحب بتلاتے تھے کہ ان کا قبرستان آج بھی وہاں موجود ہے۔ اس مجلس میں وہ کبھی دلگی اور تفنن و مزاح کی باتیں بھی کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ ایک علمی آدمی کے لیے تھوڑا سا خود فراموش ہونا بھی ضروری ہے۔

عالمِ عرب کے بیشتر فضلا سے ان کے گہرے اور ذاتی تعلقات تھے اور وہ ان کا ذکر کرتے رہتے تھے۔ عربوں میں وہ شامیوں کی مہمان نوازی، نرم خوئی اور خوش اخلاقی کے بڑے معترف تھے۔ اسی طرح وہ اہلِ تونس کی تہذیب و شائستگی کے بڑے مداح تھے اور بتلاتے تھے کہ بیشتر تونسی ان مہاجروں کی اولاد ہیں جو اندلس کو خیر باد کہہ کر شمالی افریقہ میں پناہ گزین ہو گئے تھے۔ وہ جامعہ زیتونہ کے شیخ الجامعہ طاہر بن عاشور کی بھی

تعریف کیا کرتے تھے، جو بڑھاپے میں بھی نواب صدیق حسن کی طرح خوب صورت اور دیدہ زیب دکھائی دیتے تھے۔ شیخ طاہر بن عاشور نے قرآنِ مجید کی تفسیر التحریر والتنویر فی التفسیر کے نام سے لکھی ہے اور اس میں اعجاز القرآن سے خاص طور پر اعتنا کیا ہے ۔ وہ عرب قوم پرستی کو جس کا مقصد عربوں کو غیر عرب مسلمانوں سے دور رکھنا ہے، خود عربوں کے حق میں مضر سمجھتے تھے۔ وہ ترکوں کی علمی سرپرستی کے بے حد مداح تھے، جن کی علمی سرگرمیوں کی بہ دولت اسلاف کے علمی خزانے تباہ ہونے سے بچ گئے۔

لاہور سے سبکدوش ہو کر وہ کراچی چلے گئے اور وہاں خاموش زندگی گزارنے لگے۔ اس کے بعد بھی وہ ایک یا دو بار لاہور تشریف لائے اور ان سے نیاز حاصل ہوتا رہا۔ اس زمانے میں انھوں نے ابوتمام کے دیوان، الحماسۃ الصغریٰ اور علی حمزہ بصری کی التنبیہات علی اغالیط الرواۃ شائع کیں۔ مجلہ مجمع اللغۃ العربی (سابق مجلہ مجمع العلمی العربی) دمشق میں انھوں نے معجم الادبا (یاقوت) پر نقد و تبصرہ لکھا جو کئی قسطوں میں شائع ہوتا رہا۔ وہ امام رضی الدین صاغانی کی العباب الزاخر کی اشاعت کی بڑی آرزو رکھتے تھے، چنانچہ اسی رسالے میں انھوں نے اس کا مقدمہ بھی شائع کیا تھا۔ کراچی میں جناب ممتاز حسن مرحوم (سابق معتمد مالیات حکومتِ پاکستان) اور پیر حسام الدین راشدی ان کے بڑے مداح اور عقیدت مند تھے اور میمن صاحب کی ان کے ہاں آمد و رفت رہا کرتی تھی۔ علمی حلقوں میں ان تینوں کی بذلہ سنجی، لطیفہ گوئی اور باہمی طنز و مزاح مشہور تھی۔ ممتاز حسن مرحوم کی تحریک سے انھوں نے اردو بورڈ کے زیر اہتمام عربی لغت اور اس کی خصوصیات پر کئی خطبات دیے تھے، جو اردو بورڈ کے سہ ماہی مجلے میں کئی قسطوں میں شائع ہوئے تھے۔ اب ضرورت ہے کہ پیر حسام الدین راشدی ان خطبوں کو کتابی شکل میں شائع کرنے کا اہتمام فرمائیں۔ میمن صاحب چند برس سے تنہائی کی زندگی بسر کر رہے تھے، اہلیہ کا انتقال ہو چکا تھا اور لڑکے ملازمت کے سلسلے میں کہیں باہر مقیم تھے۔ ہمشیرہ کے علاوہ ایک پوتا ان کی خبر گیری کیا کرتا تھا۔ آخری عمر میں نہایت لاغر اور کمزور ہو گئے تھے، لیکن حافظہ برابر اپنا کام کرتا رہا اور کتابیں ان کی مونس و ہمدم بنی رہیں۔ انھوں نے نوّے برس کی عمر میں، جو طویل تعلیمی اور علمی خدمات سے معمور تھی، ۲۷ اور ۲۸ اکتوبر ۱۹۷۸ء کی درمیانی شب کو اپنی ہمشیرہ کے ہاں انتقال کیا۔

مولانا عبدالعزیز میمن یادداشت میں، علمائے سلف کا نمونہ تھے۔ سیکڑوں عربی قصائد اور ہزاروں اشعار نوکِ زبان تھے۔ کتبِ درسیہ میں دیوان المتنبی اور دیوان الحماسۃ تقریباً مکمل حفظ تھے۔ مفضلیات، الکامل (المبرد)

اور کتاب البیان والتبیین (جاحظ) کے بیشتر حصے ازبر تھے۔ وہ عرب ممالک میں ابوالعلا المعری پر اتھارٹی (سند) سمجھے جاتے تھے۔ نادر علمی کتابوں کی اشاعت اور انتخاب میں ان سے مشورہ ناگزیر تھا۔ وہ مجمع اللغۃ دمشق اور قاہرہ کے بھی رکن تھے۔ میمن صاحب مسلکاً اہل حدیث تھے، لیکن نہایت فراخ دل تھے اور جمود سے پاک ـــ! سیر و سیاحت اور مختلف الخیال اصحابِ فکر و نظر کی میل ملاقات نے ان کو وسیع النظر بنا دیا تھا۔ وہ امام شافعی کے بے حد عقیدت مند اور مداح تھے اور اصولِ فقہ میں ان کے الرسالہ کی عربیت کی بڑی تعریف کرتے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ جتنے علمی و ادبی مآخذ و مصادر عبدالقادر بغدادی (مصنف خزانۃ الادب) کی دسترس میں تھے، وہ آج تک کسی عالم یا ادیب کو حاصل نہیں ہو سکے۔ مستشرقین میں وہ مسٹر سالم کرینکو (KRENKOW) جو اُن کے ساتھ علی گڑھ میں کام کر چکے تھے، کی وسعتِ معلومات اور ژرف نگاہی کے ثناخوان تھے۔

مولانا میمن درس نظامی کے نصابِ تعلیم میں اصلاح و ترمیم کی ضرورت شدت سے محسوس کرتے تھے۔ نحو میں کافیہ اور شرح ملا جامی جیسی کتابوں کے بجائے الفیہ کی بعض شروح اور ابنِ ہشام کی کتابیں پسند کرتے تھے۔ وہ بتلاتے تھے کہ کافیہ اور اس کی شروح وغیرہ عرب ممالک میں کہیں بھی نہیں پڑھائی جاتیں، جب کہ صدیوں سے ہمارے ہندوستانی علما کی ذہنی توانائیاں کافیہ وغیرہ کی عقدہ کشائیوں میں صرف ہو رہی ہیں۔ ابتدائی تعلیم کے لیے امام نووی کی ریاض الصالحین کی سفارش کرتے تھے جس میں نورِ نبوت کے علاوہ ادبی چاشنی بھی پائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ سنن ابی داؤد کی کتاب الادعیہ اور ترمذی کی کتاب الزہد و الرقاق کے مطالعہ کی بھی تاکید کیا کرتے تھے۔ تفسیر میں جلالین کے بجائے جامع البیان کی افادیت کے قائل تھے۔ ابنِ خلدون نے جن کتابوں کو اصول فن ادب قرار دیا ہے، ان کے متعلق انھوں نے الندوہ (دورِ جدید) میں میری محسن کتابوں کے عنوان کے تحت بڑا دلچسپ تبصرہ لکھا تھا۔ ان کی یہ رائے تھی کہ الکامل (المبرد) ایک مبتدی کے لیے زیادہ مفید ہے، ادب الکاتب کو اقتصار کے ساتھ پڑھا جائے تو انسان کو ایک محقق لغوی بنا سکتی ہے۔ کتاب البیان والتبیین (جاحظ) میں فصیح نظم و نثر کے نمونے ان چاروں سے زیادہ ہیں، اور نوادرِ لغت و شعر امالی القالی میں سب سے زیادہ ہیں۔ ان کے نزدیک حماسیات میں ابوتمام کا دیوان الحماسہ سب سے بہتر ہے اور نقد الشعر کے لیے ابن رشیق کی کتاب العمدہ بہترین کتاب ہے۔ کہا کرتے تھے کہ الغریب المصنف (ابن سلام) اور اصلاح المنطق (ابن السکیت) وہ کتابیں ہیں، جن کا یاد ہونا ایک ادیب

کے لیے نہایت ضروری ہے۔ اوّل الذکر شاید ابھی تک شائع نہیں ہوسکی جب کہ مؤخر الذکر کتاب استاذ عبدالسلام محمد ہارون کی علمی کاوش سے بڑی آب وتاب سے شائع ہو چکی ہے۔

اس علم وفضل کے باوجود ان میں غرور وتمکنت نام کو نہ تھا۔ ان کی طرزِ معاشرت سادہ اور درویشانہ تھی۔ وہ سودا سلف خود بازار سے خرید کراتے تھے اور بھاؤ چکاتے وقت دکان دار سے خوب بحث وتکرار کرتے تھے۔ ان کی درازیٔ عمر کا راز سادہ خوراک اور محنت ومشقت میں مضمر تھا۔ حُقّے کے شوقین تھے۔ طالب علموں کے استفسارات کا خندہ پیشانی سے جواب دیتے، لیکن زیادہ سوالوں سے گھبراتے تھے۔ لاہور اور کراچی کے بعض احباب ان کی تنگ مزاجی و بخل کے افسانے سناتے ہیں، لیکن ان کی حیثیت سنی سنائی باتوں سے زیادہ نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ وہ دیر آشنا اور جزرس تھے، لیکن اس کے باوجود انھوں نے عربی خواں طلبا کے لیے لاکھوں روپوں کے عطیات کراچی اور پنجاب کی یونیورسٹیوں کو دیے۔ دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ کو تین لاکھ روپے عطا کیے اور کم وبیش اتنی رقم مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو دی۔ انھوں نے اپنا قیمتی کتب خانہ حیدرآباد یونیورسٹی کو دے دیا۔ جب حدیث کی مشہور کتاب مصنف عبدالرزاق شائع ہوئی تو پچاس ہزار روپے خرچ کر کے اس کے بہت سے نسخے خریدے اور عربی مدارس اور یونیورسٹیوں میں مفت تقسیم کیے۔

راقم السطور پر ان کا بڑا احسان ہے کہ انھوں نے ادب سے ہٹا کر علم حدیث کی طرف متوجہ کیا۔ اس کی اہمیت اور افادیت واضح کی اور ہندوستانی محدثین کی عظمت اور ان کے علمی کارناموں سے متعارف کرایا۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس علم کے شیدائی اور اپنے حبیب پاکؐ کی زبان کے خدمت گزار کے درجات بلند کرے اور ان کو کروٹ کروٹ جنّت نصیب فرمائے۔ آمین۔

مجمع البحرین (شیعہ سنّی متفق علیہ احادیث) : مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی

یہ کتاب وحدتِ امت کی طرف ایک اہم قدم ہے۔ اس میں وہ احادیث وروایات جمع کی گئی ہیں جو شیعہ اور اہل سنت کے درمیان متفق علیہ حیثیت رکھتی ہیں۔ شروع میں علامہ مفتی جعفر حسین مجتہد کا تعارف وتبصرہ اور علامہ نصیر الاجتہادی کی تقریظ ہے۔

صفحات: ۲۸، ۲۲۲ قیمت: -/۹ روپے

ملنے کا پتا: ادارۂ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور